اسلامی فلسفہ اخلاق میں ابن مسکویہ کے نظریۂ سعادت کی اہمیت

The importance of Ibn Miskawaih's theory of gladness [In Islamic philosophy of ethics]

Shfaqat Ali
PhD Scholar, University of Lahore:shafaqatali0033@gmail.com

ABSTRACT

Abū ʿAlī Aḥmad bin Muḥammad bin Yaʿqūb bin Mīskawayh, commonly known as Ibn-e-Mīskawayh is the Persian scientist, philosopher, and historian of tenth century, whose scholarly works became models for later generations of Islamic thinkers. All his works are considered the basic source of the related subject, but his most notable contributions, however, were in ethics and history. His moral treatise Tahdhīb al-akhlāq, influenced by the Aristotelian concept of the mean, is considered one of the best statements of Islamic philosophy. The theory presented by him in this respect is called Al-sʿādah that consists four elements; Wisdom, Shūjʿah, ʿIffat and Justice. He divided Sʿādah in two categories; primary Sʿādah and secondary Sʿādah. Primary Sʿādah is the moral perfection while the secondary is the theoretical perfection that means to attain the knowledge of God (insight in divine matters or metaphysical world) The style of the theory is philosophical, but the approach is practicable and purposeful. In this article, his theory of Sʿādah has been discussed briefly.

ابن مسکویہ کو اسلامی فکر کی تاریخ میں ایک اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ پہلے مسلم فلسفی تھے جنہوں نے باقاعدہ ایک نظامِ اخلاق مرتب کیا۔ مسکویہ سے قبل اخلاقی مسائل یا تو مذہبی مباحث کے ساتھ ملے ہوئے تھے، یا تصوف کے ایک حصہ کے طور پر اُن کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ کبھی اخلاقی مباحث سیاسی فلسفہ کے مقدمہ کے طور پر بیان ہوتے تھے اور کبھی کہانیوں یا (اساطیر) کا رنگ اختیار کر لیتے تھے۔ مسکویہ نے اخلاقیات کو ایک آزاد اور مستقل بالذات حیثیت دی اور یوں اس علم کو اسلامی علوم کا لازمی حصہ بنا دیا۔ اس میدان میں اُن کی حیثیت بلاشبہ ایک پیش رو کی ہے اسی لئے اُن کے اثرات بعد میں اخلاقیات پر لکھنے والے تمام حکماء کی تحریروں میں جابجادِ کھائی دیتے ہیں۔

مسکویہ اعلیٰ پائے کے ادیب، شاعر ، طبیب، مورّخ، فلسفی اور"معلم اخلاق تھے۔ اُنہوں نے کئی موضوعات پر گرانقدر کتابیں تصنیف کیں۔ قدیم وجدید اور مسلم و غیر مسلم علماء و مستشرقین مسکویہ کی تصانیف کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تاریخ میں اُن کی شہرۃ آفاق کتاب "تجارب الامم" اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح فلسفہ اخلاق میں اُن کی تصنیف "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ہر صاحب علم و فکر واقف ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن دنیا کے مختلف ممالک میں شائع ہوئے ہیں۔ اسی کتاب نے بعد کے فلاسفہ اخلاق کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے جن میں غزالی، نصیر الدین طوسی، رفاعہ طنطاوی، شیخ محمد عبدہ اور اقبالؒ وغیرہ بطورِ خاص شامل ہیں۔

ابن مسکویہ علامہ اقبال کی نظر میں:

عظیم مسلم فلسفی ابن مسکویہ کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں کئی بار ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں بڑے احترام سے ابن مسکویہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب ہم ایک عالی مرتبہ نام کی طرف آتے ہیں یعنی ابو علی محمد ابنِ محمد ابن یعقوب المعروف ابنِ مسکویہ جو الٰہیاتی مفکرین، ماہرینِ طبیعیات، ماہرینِ اخلاق اور ایران کے تاریخ دانوں میں سے ایک اہم نام ہے۔ میں نے اس کی بیروت میں چھپنے والی مشہور کتاب الفوزالاصغر سے ذیل میں اس کے فکر کا خلاصہ دیا ہے۔"(1)

علامہ اقبال ابنِ مسکویہ کے اخلاقی پروگرام سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اس کے نظریہ ارتقا کا بھی ذکر کیا ہے جو دراصل اس کا نظریہ نبوت ہے۔ ابنِ مسکویہ نے بچوں کی تربیت کا جو عملی پروگرام دیا ہے علامہ اقبال نے اسی طرح کا فکر اپنے اشعار میں بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے۔ تربیتِ اطفال ایک اہم دینی فریضہ ہے جس پر ابنِ مسکویہ نے بہت زور دیا ہے۔ علامہ اقبال نے بانگِ درا میں بچوں کے لیے سبق آموز منظوم کہانیوں میں یہ پیغامِ تعلیم وتربیت بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔

ابنِ مسکویہ کے فکر و نظر کا مرکزی نقطہ اخلاق ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت سے ان کے اخلاق سنوارے جاسکتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی یہی سب کچھ چاہتے تھے۔

---

(1)Muhammad Iqbāl, ʿAllāma, The Developement of Metaphysics in Persia, Bazam-e-Iqbāl, Lahūre. P: 24

ابتدائی حالات

ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ 320ھ / 942ء میں رے میں پیدا ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد ماں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ ماں کی دوسری شادی ہو جانے پر ماں بیٹے کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ لہٰذا وہ خاطر خواہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کر سکے۔ البتہ قیاس ہے کہ اُنہوں نے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، تاریخِ عرب اور حساب وغیرہ کی ابتدائی تعلیم اُس دور کے مروّجہ طریقہ کے مطابق مساجد میں ہی حاصل کی ہوگی۔(2)

معاشی خود مختاری اور آسودگی کی خواہش اُنہیں کیمیا گری (سونا بنانے کا فن) کی طرف لے گئی۔ اس مقصد کے لیے اُنہوں نے رازی اور جابر بن حیان وغیرہ کی کتابوں کو بھی پڑھا۔ لیکن کافی مال اور وقت ضائع کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ یہ کوشش بے سود ہے۔ بعد ازاں بغداد چلے گئے جہاں وزیر المہلبی کے ساتھ وابستہ ہوئے اور اُس کے اتنا قریب ہو گئے کہ اُس نے اُنہیں اپنا ندیم (Fellow -Drinker) بنا لیا۔ المہلبی کے دربار میں مسکویہ کا کام عریاں اور اخلاق سوز نظموں کو موزوں ادبی رنگ میں پیش کرنا تھا اور دربار کے تمام اخلاق سوز کاموں میں شرکت بھی کرتے تھے جس کا تذکرہ اُنہوں نے بڑی حسرت کے ساتھ اپنی مشہور و معروف تصنیف "تہذیب الاخلاق" میں کیا ہے۔

المہلبی کے انتقال کے بعد مسکویہ بغداد سے واپس رے آ گئے اور امیر رکن الدولہ کے مشہور وزیر ابو الفضل ابن العمید (م970ء) سے منسلک ہو گئے جس نے اُنہیں اپنے کتب خانہ کا ناظم مقرر کر دیا۔ ابن العمید کا کتب خانہ فلسفہ، مذہب، ادب، تاریخ اور طب و شاعری غرض تقریباً ہر موضوع پر بیش بہا خزانہ تھا جو اُسے اپنی تمام املاک سے زیادہ عزیز تھا۔ یہاں مسکویہ کو مطالعہ کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ 979ء میں ابن العمید کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا ابو الفتح ابن العمید وزیر مقرر ہوا۔ اُس نے مسکویہ کو اُن کے عہدے پر برقرار رکھا۔ ابن العمید کی زندگی میں وہ ابو الفتح کے اُستاد بھی تھے۔ ابو الفتح کے قتل کے بعد مسکویہ دوبارہ بغداد لوٹ گئے۔ اس بار اُنہوں نے بادشاہ عضد الدولہ کے دربار میں زبردست اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ وہ اگرچہ ناظم کتب خانہ تھے تاہم سفیر اور خزانچی کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ اُنہیں بادشاہ کا اعتماد اس حد تک حاصل تھا کہ بعض مواقع پر اُس کے

---

(2) التوحیدی، ابو حیان، اخلاق الوزیرین، دمشق، 1965ء، ص525

Al-tawhīdī, ʾAbū Hayyān, ʾAkhlāq al-wazīrayn, Dimashq, 1965. P:525

پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے بھی ذمہ داریاں سرانجام دینے کا موقع ملا۔ 983ء میں عضد الدولہ کے انتقال کے بعد اُس کے تینوں بیٹوں صمصام الدولہ، شرف الدولہ اور بہاءالدولہ نے بھی یکے بعد دیگرے مسکویہ کی حیثیت کو برقرار رکھا۔ چنانچہ وہ بہاءالدولہ کی وفات (1012ء) تک وہیں پر رہتے ہوئے کتب خانے کے انتظام وانصرام کے ساتھ ساتھ تاریخ، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر کتب تصنیف کرتے رہے۔

سینتیس سال تک یونہی وزراء اور امراء کی خدمات سرانجام دینے کے بعد مسکویہ شاہِ خوارزم کے پاس طبیب کی حیثیت سے رہنے لگے۔ نوے سال کی عمر میں خوارزم شاہ کے دربار سے نکل کر عمیر الملک کے دربار کی زینت بن گئے۔ یہاں بھی اُنہیں بہت زیادہ عزت افزائی اور قدر و منزلت میسر آئی تقریباً سوسال کی عمر میں اصفہان میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

جس زمانے میں مسکویہ خوارزم شاہ کے دربار میں تھے تو اُن کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ اُنہیں احساس ہوا کہ اُنہوں نے اپنی قیمتی زندگی کو ناؤ و نوشِ اور لہو و لعب میں برباد کر دیا ہے۔ اُنہیں روحانیت اور اخلاقِ حسنہ کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ یہ تبدیلی کس وقت رونما ہوئی اس کے متعلق قطعی طور پر تو کچھ کہنا دشوار ہے تاہم یہ بات طے ہے کہ اُن کی سوچ میں یہ تغیر عمر کے آخری حصے میں ہی رونما ہوا۔ اس کے نتیجے میں اُنہوں نے دیگر کتابوں کے علاوہ اخلاقیات پر ایک لازوال کتاب "تہذیب الاخلاق" اور مابعد الطبیعات پر "الفوزالاصغر" تصنیف کیں۔(3)

تصانیف:

ابن مسکویہ کی تصنیف و تالیف کا کام جس سے ان کی علمی قابلیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے درج ذیل ہیں:
(1) تجارب الأمم وتعاقب الهمم(2) كتاب آداب العرب والفرس(3) تهذيب الأخلاق وتطهير الأعراق(4) الفوز الأصغر(5) رسالة في اللذات والآلام في جوهر النفس(6) أجوبة در مسئلة في النفس والعقل(7) رسالة في جواب في (كذا، عن) سأل على ابن محمد أبي حيان الصوفي في حقيقة العدل(8) نديم الفريد وأنيس الوحيد(9) رسالة مسكويه رازى(10) الفوز الأكبر(11) أنس الفريد(12) ترتيب السعادات(13) كتاب الجامع(14) كتاب السير(15) كتاب الأشربة(16) كتاب الأدوية المفردة(17)

(3)Ansārī, Dr. M. ʿAbdul Haq, The Ethical Philosophy of Mīskawayh, The ʿAlī Garh Muslim university Press, India , 1964.P: 18-22

كتاب الباجات من الأطعمة(18) كتاب السياسة(19) الشوامل(20) تعليقات(21) المقالات الجليلة(22) كتاب المستوفى

ابنِ مسکویہ کا نظریہ سعادت

ہر دور میں علم الاخلاق کا مرکزی مسلہ یہ رہاہے کہ خیر و شر کی معرفت کا پیمانہ کیا ہے؟یعنی وہ کون سا معیار ہے جس کے ذریعہ اشیاء پر خیر و شر کا حکم لگایا جائے گا اور کسی عمل کے اچھا یا بُرا ہونے کا تعین کیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں ماہرین علم الاخلاق میں اختلاف رہاہے۔ بعض مفکرین "عرف" کو خیر وشر کا پیمانہ قرار دیتے ہیں تو بعض لذت کو۔ کسی نے "فراست" کو معیار قرار دیا تو کوئی "منفعت" کو معیار بنانے کا قائل ہے۔ تاہم حکمائے اسلام کی کثیر تعداد جس میں ابن مسکویہ، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے لوگ شامل ہیں وہ "سعادت" کو خیر وشر کا پیمانہ مانتے ہیں اور یہی نظریہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ سعادت سے مراد صرف دنیوی کامیابی و کامرانی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ فوز و فلاح ہے جس میں دنیوی زندگی کی بہتری کے ساتھ ساتھ اُخروی زندگی کی ابدی بھلائی بھی شامل ہو۔ اسے سعادتِ حقیقی، سعادتِ ابدی، سعادتِ تامہ اور مثلِ اعلیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث اور صوفیاء کے ہاں رضائے الٰہی اور "نفس مطمئنہ "کی اصطلاحات بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔

اسلامی اخلاق کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کے حوالے سے مسکویہ کو خصوصی اہمیت و اولیت حاصل ہے۔ مسکویہ کے نزدیک اخلاق کا بنیادی مسئلہ سعادت ہی ہے۔ اُس کی پہلی کتاب "السعادة" بطورِ خاص اس کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ اُس کی دوسری بڑی اور جامع کتاب "تہذیب الاخلاق" کا تیسرا باب مکمل طور پر اسی نکتے کی تشریح و تفصیل پر مشتمل ہے۔ پھر اسی کتاب کے آخری تین ابواب میں روح کی مابعد الطبیعاتی نوعیت کے ضمن میں اس مسلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں "الفوز الاصغر " میں بھی اس حوالے سے کافی مباحث موجود ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسکویہ کے نظامِ اخلاق میں مسلہ سعادت کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔

سعادت کیا ہے؟

عام طور پر سعادت کو خوشی ، کامیابی ، خوشحالی اور عزت وغیرہ کے معنوں میں لیا جاتا ہے اور ان چیزوں یا ان میں سے بعض کے حصول کو سعادت کی علامت سمجھ لیا جاتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جو سعادت کا نعم البدل بن سکے۔ نہ ہی سعادت محض ان چیزوں کے حصول تک محدود ہے۔

مسکویہ کے نزدیک سعادت کا حقیقی تصور کیا ہے؟اس کو سمجھنے کے لیے ذیل میں مسکویہ کے نظریات کا خلاصہ دیا جارہاہے۔

"اس کائنات میں موجود تمام اشیاء خواہ وہ جانور، پودے اور دیگر ٹھوس اجسام ہوں یا اُن کے عناصرِ ترکیبی مثلاً آگ، ہوا، مٹی اور پانی اسی طرح دیگر مظاہرِ کائنات مثلاً سورج اور ستارے ان میں سے ہر ایک کی مخصوص نوعیت اور منفرد کردار ہے جس کی بنا پر وہ دوسروں سے ممیز اور ممتاز ہے۔ اگرچہ بعض خصوصیات مشترکہ بھی ہوتی تاہم ہر وجود کا وہ مخصوص کردار جس کے لیے وہ پیدا کیا جاتا ہے وہ اُسے دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔ ہر وجود اپنے مخصوص کردار کو جس بہترین انداز میں ادا کر سکتا ہے کوئی بھی دوسرا اُسے اُس طرح سرانجام نہیں دے سکتا یہ ایک آفاقی قانون ہے جو زمین و آسمان کی ہر چیز پر لاگو ہوتا ہے۔ایک چیز اچھی ہے اگر وہ اپنے مخصوص کردار کو بہترین انداز میں ادا کر رہی ہے اور جس قدر وہ اپنے مقصد کو پورا کر رہی ہے۔ اُسی نسبت سے وہ کامل کہلائے گی۔ مثلاً ایک تلوار کو قتل کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ تلوار بہترین اور زیادہ کامل سمجھی جائے گئی جو زیادہ اچھا اور گہرا کاٹے گی۔ یہی معاملہ ایک گھوڑے کا ہے اور یہی ضابطہ ہر دوسری چیز کے لیے ہے۔ لیکن اگر ایک گھوڑا اپنی مخصوص کارکردگی کو سرانجام دینے میں ناکام ہو جاتا ہے اور اپنے کمالِ فن کا اظہار نہیں کر پاتا تو ایسے گھوڑے کے ساتھ اگر گدھے والا برتاؤ کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔"(4)

اسی طرح کی بحث "السعادۃ" میں تھوڑے سے مختلف انداز میں کی گئی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

"ہر وہ چیز جو موجود ہے اُس کا کوئی مخصوص مقصد ہے جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت بطور خاص فنونِ لطیفہ میں زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کا کوئی آلہ یا چیز بغیر کسی مقصد کے نہیں ہوتی۔ مزید برآں کوئی چیز یا آلہ کسی دوسرے کے کام کو مکمل طور پر سرانجام نہیں دے سکتا۔ ہر ایک کی اچھائی کا دارو مدار اس نکتے پر ہے کہ جس مخصوص کردار کو ادا کرنے کے لیے اُسے بنایا گیا ہے اور جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے وہ اُسے اچھی طرح ادا کرے۔ یہ حقیقت مظاہرِ فطرت کے معاملے میں اور زیادہ صادق آتی ہے

(4)مسکویہ، ابو علی، احمد بن محمد، کتاب السعادۃ، مکتبۃ المحمدیہ، مصر، 1928ء ص33,34
Mīskawayh, Abū ʿAlī, Ahmad b. Muhammad, Kitāb al-saʿādah, maktabah al-Muhammadiyya, Egypt. 1928. P: 33-34

کیونکہ فطرت کسی بھی وجود کو بلا مقصد پیدا نہیں کرتی۔ کوئی بھی چیز یا جسم بطورِ کل ہو یا اُس کا کوئی حصہ ہو، ہر ایک کا ایک خاص کام ہے جو دوسروں سے مختلف ہے اور وہ اُسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ کوئی بھی وجود یا اُس کا کوئی حصہ کسی دوسرے کا بدل نہیں بن سکتا اور نہ اُس کا مخصوص کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس قانون کا اطلاق روح کے معاملے میں کہیں زیادہ مستند ہے جو کہ فطرت سے برتر ہے۔ لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کی سعادت اُس مخصوص کردار کو ادا کرنے میں مضمر ہے جو اُس کے ساتھ مختص ہے۔ انسان تمام مخلوقات میں سے افضل و اعلیٰ ہے اور اُس پر یہ قانون نہایت اعلیٰ درجے میں لاگو ہوتا ہے۔"(5)

سلسلہ ارتقاء میں انسان کی امتیازی شان اور مقصدِ تخلیق:

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجوداتِ عالم میں انسان کا مقام و مرتبہ کیا ہے اور اُس حوالے سے اُس کی تخلیق کی غایت کیا ہے؟ جب ہم کائنات پر نظر دوڑاتے ہیں تو انواع و اقسام کی مخلوقات مختلف درجات میں منقسم دکھائی دیتی ہیں۔ سب سے نچلا اور ادنیٰ درجہ جمادات کا ہے جن میں زندگی خوابیدہ حالت میں ہے۔ نہ تو وہ حرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی نشوونما پا سکتے ہیں جمادات سے اوپر والا درجہ نباتات کا ہے جو اگرچہ ایک سے دوسری جگہ تو نہیں جا سکتے تاہم اپنی جگہ پر رہتے ہوئے نشوونما پاتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اُن میں کئی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ نباتات سے اوپر والے درجے میں حیوانات آتے ہیں جن میں نشوونما کے ساتھ ساتھ آزادانہ نقل و حرکت اور بعض دوسری چیزیں ہوتی ہیں جو نباتات کی دنیا میں مفقود ہوتی ہیں۔ تاہم اُن میں زیادہ تر حرکات و سکنات اور افعال جبلی ہوتے ہیں جن میں عقل و شعور کا عمل دخل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے۔ اُن سے اُوپر انسان کا درجہ ہے جو اس معلوم کائنات میں بلند ترین درجہ ہے۔ انسان میں نشوونما، آزادانہ نقل و حرکت کے ساتھ ساتھ اختیار اور عقل و شعور کی قوتیں بھی موجود ہوتی ہیں جن سے دیگر مخلوقات محروم ہوتی ہیں۔(6)

---

(5)مسکویہ، ابو علی، احمد بن محمد، کتاب السعادۃ، مکتبۃ المحمدیہ، مصر، 1928ء ص34,33

Mīskawayh, Abū ʿAlī, Ahmad b. Muhammad, Kitāb al-saʿādah, maktabah al-Muhammadiyya, Egypt. 1928. P: 33-34

(6)تہذیب الاخلاق، ص55-58

Tahdhīb al-ʾAkhlāq, p: 55-58

موجوداتِ عالم میں انسان کی امتیازی حیثیت کا جو نظریہ ابنِ مسکویہ نے دیا ہے اُس کی تصدیق جا بجا قرآنِ مجید سے بھی ہوتی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ(7)"بے شک ہم نے انسان کو بڑے عمدہ انداز میں پیدا کیا ہے"

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ(8)"اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے"

انسانیت کی ابتدا جہالت و لاعلمی سے ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ قوت فکر و تمیز اور علم و آگہی بڑھتی ہے اور انسانیت وحشی پن سے نکل کر تہذیب و تمدن کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ فکر و تمیز ترقی کرتے کرتے جب خود شناسی کی منزل پر پہنچتی ہے تو اس کی سرحد خدا شناسی سے مل جاتی ہے۔ یہ فلسفی یا صوفی کا مقام ہے جو ریاضت و مشقت کر کے حقیقتِ مطلق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں کی اقلیم کے قریب ہیں۔ آخر میں وہ منفرد ہستیاں ظاہر ہوتی ہیں جنھیں ہم پیغمبر کہتے ہیں۔ یہ الوہیت کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں اور اس طرح وجود کا دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔(9)

سلسلہ ارتقاء میں جو چیز انسان کو دیگر موجودات سے ممتاز کرتی اور اسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشتی ہے وہ ہے قوت فکر و تمیز یا عقل۔ یہی وہ قوت ہے جو اسے خود شناسی سے خدا شناسی کی منزل تک لے جاتی اور خدا کی نیابت کا مستحق بناتی ہے۔ پس انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حکمت و دانائی کا نمونہ بنائے۔ اس کے نفس کی سعادت بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنی عقل کو کامل سے کامل تر بنائے اور عقل کا یہ کمال عمل میں بھی ظاہر ہو اور علم میں بھی عقل کے چونکہ دو درجے ہیں، ایک درجہ عمل کا دوسرا علم و نظر کا، اس لیے نفس کی سعادت کے بھی دو درجے ہوں گے: ایک سعادتِ اخلاقی، دوسری سعادت قصویٰ۔ اخلاقی سعادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان عقل، غضب اور شہوت کی تہذیب و اصلاح کے ذریعے اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرے۔ سعادت قصویٰ کا مطلب یہ ہے کہ دین، سائنس اور فلسفے کے مطالعے کے ذریعے انسان پہلے

---

(7)التین4:95

Sūrah, Al-tīn, 95:4

(8)الاسراء70:17

Sūrah, Al-īsrā᾽,17:7

(9)تہذیب الاخلاق، ص59

Tahdhīb al-᾽Akhlāq, p: 59

اپنی ذات کو پہچانے اور پھر خدا کی معرفت حاصل کرے۔ مسکویہ نے انسان کی سعادت کا تصور اس کی تخلیق کے مقصد سے اخذ کیا ہے۔(10)

جہاں تک سعادتِ اخلاقی کا تعلق ہے اس حوالے سے قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً(11)"اللہ کا رنگ، اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے رنگ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

تخلقوا بأخلاق الله(12) "اللہ کے اخلاق اپناؤ"

جہاں تک سعادتِ قصویٰ کا تعلق ہے اس حوالے سے قرآن کا کہنا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ(13)"اور میں نے جن اور انسان کو بنایا ہے تو صرف اپنی بندگی کے لیے"

رئیس المفسرین حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہاں عبادت کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: أي ليعرفون(14) "یعنی میری پہچان حاصل کریں"

سعادتِ اخلاقی اور سعادتِ قصویٰ کی مختصر تشریح درج ذیل ہے۔

---

(10)تہذیب الاخلاق، ص33؛ کتاب السعادۃ، ص35،34

Tahdhīb al-ʾAkhlāq, p: 33, Kitāb al-saʿādah, p: 34-35

(11)البقرہ138:2

Sūrah, Al-baqarah, 2:138

(12)مبارک پوری، ابو العلا، محمد عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم(1283-1353ھ) تحفۃ الاحوذی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س ن، 29/6

Mūbārak Pūrī, Abū al-ʿAlā, Muhammad ʿAbd Al-rehmān b. ʿAbd Al-rahīm, Tuḥfa al-Al-ʾahwadhī, dār al-kutub al-ʿilmiyyah, Beirut, Lebonan. 6:29

(13)الذاریات56:51

Sūrah, Al-dhariyāt, 51:56

(14) آلوسی، ابو الفضل، شہاب الدین السید محمود، روح المعانی فا تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن، 25/27

ʾAlūsī, Abū al-fadhal, shihāb al-dīn, al-syed Mahmūd, (1854), Rūh al-mʿānī fī tafsīr al-qurʾān al-azīm wal-sabʿī al-mathānī, dār iḥyā al-turāth al-ʿarabī, Beirut, Lebonan.27:25

سعادتِ اخلاق:

نفس انسانی تین قوتوں پر مشتمل ہے: قوت ناطقہ، قوت غضبیہ اور قوت شہویہ۔ابنِ مسکویہ نے "تہذیب الاخلاق" میں نفس کی ان قوتوں کی تعریف یوں بیان کی ہے۔

(١) القوة الناطقة

"یہ وہ چیز ہے جن میں قوت ناطقہ کے بارے میں فکر و تمیز اور نظر عمیق ہو اور اس کا نام ملکیت ہے اور اسے بدن کے ذریعہ سے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا آلہ و مرکز دماغ ہے۔"(15)

(٢) القوة الغضبية

"اس قوت کا نام مسکویہ نے 'حیوانی نفس رکھا ہے اس قوت کا خاصہ جہاں غصہ اور ظلم ہے وہیں اس قوت کے تحت انسان بڑے بڑے مصائب اور چیلنجز کا مقابلہ بھی کرتا ہے۔ اس نفسانی خواہش کے تحت انسان دوسروں کو زیر کر کے بلند و بالا مراتب اور کمالات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس قوت کا مرکز دل ہے۔"(16)

(3) القوة الشهوية

"اس قوت کا نام مسکویہ نے النفس البہیمیہ رکھا ہے یعنی جانوروں کا سا نفس اس کے اندر شہوات جنم لیتی ہیں اعلیٰ غذا کی طلب اور لذتیں حاصل کرنے کا شوق، جو کہ ماکل و مشارب (کھانے پینے کی اشیاء) اور منا کح (نکاح) میں ہوتا ہے اس کو حاصل کرنے کی رغبت بڑھ جاتی ہے اس قوت کا مرکز جگر ہے۔"(17)

قوت شہویہ کا درجہ سب سے ادنیٰ ہے، قوت غضب اوسط درجہ میں ہے اور قوت ناطقہ سب سے اشرف واعلیٰ ہے اس کے ذریعہ سے انسان جانوروں کی شہوات سے نکل کر ملائکہ کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

---

(15)تہذیب الاخلاق،ص19

Tahdhīb al-ʾAkhlāq, p: 19

(16)ایضا

ibid

(17)ایضا

ibid

ان قوتوں کی تہذیب و تربیت سے انسان کے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی سعادت کے پہلے درجے یعنی سعادت اخلاقی تک پہنچتا ہے۔ ان کی تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر نفسی قوت کو ایک خاص حد کے اندر نشو ونما کا پورا موقع دیا جائے۔ کسی قوت میں اپنے حق سے زائد کا مطالبہ کرنے کی عادت نہ پڑنے پائے۔ کوئی قوت اتنی خود سر نہ ہونے پائے کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر کے نفس کی دوسری قوتوں کی حق تلفی کرے۔ یعنی ہر قوت کی تربیت میانہ روی اور اعتدال کے اصول پر کی جائے۔ اعتدال کا راستہ ہی نیکی اور ہدایت کا راستہ ہے۔ امام غزالی نے "صراط مستقیم" کے یہی معنی بتائے ہیں۔ اعتدال سے تجاوز افراط (زیادتی) کی طرف ہو سکتا ہے یا تفریط (کمی) کی طرف، اور یہ دونوں ہی برائی اور گمراہی کے راستے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک نیکی دو برائیوں کے درمیان ایک وسط ہے۔ اسی طرح افلاطون کے یہاں توافق اور اعتدال ہی نیکی کا راستہ ہے۔ یہی قرآن و حدیث کی تعلیمات ہیں۔ اسلامی تعلیمات سے اسی مطابقت کی بنا پر مسکویہ نے ان مفکرین کے نظریہ اخلاق سے کافی فائدہ اٹھایا جس کا اس نے تہذیب الاخلاق میں جگہ جگہ ذکر بھی کیا ہے۔

قرآن وحدیث میں جابجا اعتدال و توازن کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ(18)

"اور اپنے چلنے میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز پست کر" دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ(19)

"اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے کھول دے بالکل ہی کھول دینا"

ایک اور جگہ اللہ کے خاص بندوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا(20)

---

(18) لقمان 19:31

Sūrah, Luqmān,31:19

(19) الاسراء 29:17

Sūrah, Al-īsrāʾ,17:29

(20) الفرقان 67:25

Sūrah, Al-furqān, 25:67

" اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے"

حضور صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: خير الأمور أوسطها(21) "معاملات میں بہترین روش میانہ روی ہے"

اجناس فضائل

اعتدال تمام فضائل یا نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ ہر فضیلت کا تعلق نفس انسانی کی کسی نہ کسی قوت کی حالت اعتدال سے ہے۔ قوت فکر و تمیز جب اعتدال کی مقرر کی ہوئی حد کے اندر رہے، افراط یا تفریط کی طرف مائل نہ ہو تو اس سے حکمت کی فضیلت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح قوت غضبیہ میں اعتدال سے شجاعت اور قوت شہویہ کی میانہ روی سے عفت کی فضیلت پیدا ہوتی ہے۔ ان تینوں قوتوں کے باہمی توافق اور ہم آہنگی سے ایک چوتھی فضیلت پیدا ہوتی ہے جس کا نام عدالت ہے۔ حکمت، عفت، شجاعت اور عدالت۔ ان کی تعریف ابنِ مسکویہ یوں بیان کرتے ہیں:

الحكمة

"حکمتِ نفس ناطقہ ممیزہ کی فضیلت ہے اور اس سے مراد تمام موجودات کو بحیثیت موجودات کے جاننا اور ان کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اور اگر تم دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ امورِ الٰہیہ اور امورِ انسانیہ سے واقفیت کو حکمت کہتے ہیں۔ اور یہ اُس وقت مفید ہوگی جب کہ ان معقولات کے اعتبار سے بھی سمجھا جائے کہ کس کو چھوڑنا اور کس کو اختیار کرنا ہے۔"(22)

---

(21) ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابراھیم بن عثمان کوفی (159-235ھ) المصنف، مکتبۃ الرشید، الریاض، 1409ھ، رقم: 7، 179/3528

Ibn Abī Shayba, Abū Bakr ʿAbdallah b. Muhammad b. Ibrāhīm b. ʿUthmān Kūfī, al-mūsannif, Maktabah al-rashīd, al-riyādh. 1409. 7:179, #3528

(22) تہذیب الاخلاق، ص20

Tahdhīb al-ʾAkhlāq, p: 20

عفت

"عفت حس شہوانی کی فضیلت و وصف ہے اور یہ فضیلت انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنی شہوات کو راہِ راست پر لاتا ہے اور بُرائی اور اچھائی میں درست تمیز سے کام لیتا ہے اور شہوات کو اپنا غلام بناتا ہے خود شہوات کا غلام نہیں بنتا۔"(23)

شجاعت

ابن مسکویہ نے شجاعت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"شجاعت یہ نفسِ غضبیہ کی فضیلت ہے اور یہ انسان میں اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان کا نفس ناطق ممیز سے متصف و مقید ہو جاتا ہے اور اس وصف کے پائے جانے کے بعد انسان کے اندر ہیبت زدہ اشیاء کا خوف نہیں رہتا اور وہ بے خوف و خطر ہو کر وہ افعال سر انجام دیتا ہے جن کا کرنا اچھا اور صبر کرنا محمود و مطلوب ہوتا ہے۔"(24)

عدالت

"عدالت نفس کی وہ فضیلت ہے جس میں سابقہ تینوں اوصاف پائے جائیں۔ یہ ان تینوں قوی کی سا لمیت کے وقت ہوتی ہے اور یہ تمام ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں اور طبائع کی برائی کو غالب نہیں آنے دیتی اور انسان کے اندر ایسے قوت و طاقت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ ہمیشہ انصاف کو اختیار کرتا ہے اور سب سے پہلے اپنے آپ پر انصاف کو لازم کرتا ہے پھر انصاف اور انتصاف سب کیلئے پسند کرتا ہے۔"(25)

یہ چار بنیادی فضائل عمل ہیں۔ باقی تمام فضائل ان ہی کی انواع ہیں اس لیے ان کو اجناس فضائل کہتے ہیں۔ ان ہی کو حاصل کر کے انسان اپنی اخلاقی سعادت کو پہنچتا ہے۔

---

(23) ایضاً، ص20

Ibid, p: 20

(24) ایضاً

ibid

(25) ایضا

ibid

اجناس رذائل

نفس کی کسی قوت کے اعتدال کی حد میں رہ کر اپنا کام کرنے کا نام فضیلت ہے۔ جب کوئی قوت اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو وہ افراط یا تفریط کا شکار ہوتی ہے اور یہ دونوں صورتیں عدم توازن سے پیدا ہونے والی شخصی خامیاں ہیں۔ قرآن نے ہمیں اُمتِ وسط کہہ کر افراط و تفریط دونوں سے منع کیا ہے۔ رذیلت نفس کی کسی قوت کے افراط یا تفریط میں پڑ جانے کا نام ہے۔ اس اصول کے مطابق حکمت میں افراط سے چالبازی اور تفریط سے حماقت کی رذیلت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح شجاعت میں افراط سے غیر دانشمندانہ جوش اور تفریط سے بزدلی کی رذیلت پیدا ہوتی ہے۔ عفت میں افراط سے ہوس اور تفریط سے بے رغبتی کی رذیلت پیدا ہوتی ہے۔ عدالت میں افراط سے ظلم کرنا اور تفریط سے ظلم سہنے کی رذیلت پیدا ہوتی ہے۔ فضائل کے چار اجناس کے مقابلے میں اس طرح رذائل کے آٹھ اجناس ہوئے:

1-چال بازی 2-حماقت 3-غیر دانشمندی 4-بزدلی 5-ہوس 6-عدم دلچسپی 7- ظلم 8- ظلم سہنے کی عادت

یہ آٹھ بنیادی رذائل ہیں باقی تمام رذائل ان ہی کی انواع ہیں۔

اوپر کی بحث سے جو بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسکویہ نے فضائل و رذائل کا ایک ایسا نظام مرتب کیا جس میں ہر فضیلت اور رذیلت علی الترتیب نفس کی کسی نہ کسی قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے منسلک ہے۔ دینی حیثیت سے دیکھا جائے تو اسلام نے جگہ جگہ ان فضائل کے حصول پر زور دیا ہے اور رذائل سے بچنے کی تلقین کی ہے لیکن فلسفیانہ حیثیت سے اُنہیں ایک منطقی شکل دینے کا سہرا مسکویہ کے سر ہے۔ یہی اس کا وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ پہلا مسلمان مفکر ہے جس نے اخلاقیات کو عقلی بنیاد پر استوار کیا۔

(ب) سعادت قصویٰ

حکمت، شجاعت، عفت، اور عدالت کے فضائل جب انسان کو حاصل ہو جائیں اور عقل کی اطاعت کے ذریعے وہ خدا سے قرب حاصل کر کے جملہ نفسی امراض سے محفوظ ہو جائے تو سمجھو کہ وہ اپنی سعادت اخلاقی کو پہنچ گیا جو عقل عملی کے کمال کی انتہا ہے۔ لیکن یہ کمال مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے سعادت قصویٰ تک پہنچنے کا، جس سے ہماری مراد ہے عقل نظری کا وہ کمال جو اسے خدا کی معرفت کا شرف بخشتا ہے۔ سعادت قصویٰ ہی سعادت تامہ ہے جو جملہ علوم نقلی و عقلی کے مطالعے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ترتیب السعادات میں مسکویہ نے اس سے متعلق بحث کی ہے۔

عقل کے دو کام ہیں: خواہش اور غصہ کی قوتوں کی تہذیب و اصلاح کرنا اور غور و فکر کی صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما کرنا کہ مجرد تصورات کا ادراک کرنا اُن کے لیے آسان ہو جائے۔ پہلے کام کا تعلق عمل و مشق سے ہے دوسرے کا علم و نظر سے ہے۔ ان ہی کاموں کی بنا پر ارسطو نے عقل کے دو حصے کر دیے۔ ایک کا نام عقل عملی رکھا اور دوسرے کا عقل نظری۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ مسکویہ نے ان دونوں عقول کی تربیت اور نشو و نما کے لیے کیا نصاب تعلیم مقرر کیا ہے؟

طبعی ترتیب میں عقل عملی کا ظہور عقل نظری سے پہلے ہوتا ہے، اس لیے تعلیم کی ابتدا بھی ہمیں عقل عملی ہی سے کرنی چاہیے۔ اس کی تربیت کے لیے مسکویہ نے جو نصاب تجویز کیا ہے اس میں سر فہرست قرآن، حدیث اور ان سے متعلقہ علوم آتے ہیں۔ یعنی تعلیم کی اساس دین پر استوار ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ان فلسفیانہ علوم کی باری آتی ہے جن کا تعلق عمل سے ہے۔ یعنی اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات۔ حکمت عملی کے ان تینوں اجزاء پر عبور حاصل کرنے کے بعد عقل عملی کی تربیت مکمل ہو جاتی ہے۔(26)

ابن مسکویہ کے نظریہ کے مطابق عقل عملی کی تربیت کے بعد عقل نظری کی تربیت پر توجہ دینی چاہیے۔ اس کی تربیت کے نصاب میں منطق، حساب اور اقلیدس کے تجریدی علوم سر فہرست ہیں۔ ان کے بعد طبعیات، نباتیات، حیوانیات اور نفسیات کے طبعی علوم کی باری آتی ہے۔ سب سے آخر میں مابعد الطبعیات کا مطالعہ کرنا چاہیے جسے الٰہیات بھی کہتے ہیں۔(27)

عقل عملی اور عقل نظری کی اس طرح تربیت کے بعد نفس پر روحانیت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اسے اپنی عملی صلاحیتوں کے کمال کے اعتبار سے خدا کی ذات کا وجدان ہوتا ہے۔ اخلاقی جد و جہد کا منشاء صرف یہی نہیں ہے کہ انسان اپنے اندر اخلاق الٰہیہ پیدا کرے، صفات کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کی ذات کا عرفان اور رضا بھی حاصل کرے کشف و وجدان کی سعادت بھی اسے نصیب ہو۔ ابن مسکویہ سعادت کے درجات کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(26)مسکویہ، ابو علی، احمد بن محمد، الفوزالاصغر، بیروت، 1319ھ، ص145،98؛السعادہ، ص60

Mīskawayh, Abū ʿAlī, Ahmad b. Muhammad, Al-fawz al-ʾAsghar, Beirut, Lebonan.1319. P: 60

(27)ایضا

ibid

"سعادت کا آخری درجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال "افعالِ الٰہیہ" بن جائیں اور یہ "خالص خیر" کا درجہ ہے یعنی اس کی تمام مرضیات فنا ہو کر مرضیاتِ الٰہی کے تابع ہو جائیں کہ اُس کی اپنی مرضی کے کوئی معنیٰ نہ رہیں جو کچھ ہو خدا کی مرضی ہی ہو۔"(28)

اس درجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ مجید میں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اُس خاص بندے سے پیار بھرے الفاظ میں مخاطب ہوتا ہے:

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِی اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِيْ وَادْخُلِی جَنَّتِيْ(29)

"(ارشاد ہوگا) اے اطمینان والی روح اپنے رب کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو"

جب انسان اس درجہ پر پہنچ جائے جب وہ اللہ کی رضا کو ہی اپنی رضا بنالے اور صرف رب کی رضا کو مد نظر رکھے تو پھر اس کا کوئی عمل اس غرض کے علاوہ سرزد نہیں ہوگا اور وہ کسی غرض وغایت کا پابند نہیں رہے گا اور یہی درجہ مقصود و مطلوب ہے۔

أي هو الأمر المطلوب المقصود(30)"یہی امر مطلوب و مقصود ہے۔"

انسانی زندگی کا یہی وہ بلند ترین نصب العین ہے جسے قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ(31)

"کہہ دو کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے"

---

(28)تہذیب الاخلاق، ص91

Tahdhīb al-ʾAkhlāq, p: 91

(29)الفجر89:27-30

Sūrah, Al-fajr, 89:27-30

(30)تہذیب الاخلاق، ص91

Tahdhīb al-ʾAkhlāq, p: 91

(31)الانعام6:162

Sūrah, Al-inʿām, 6: 162

نظریہ "مثلِ اعلیٰ"

ابن مسکویہ سعادت کے اس آخری اور انتہائی درجہ کو "مثلِ اعلیٰ" کا نام دیتے ہیں جہاں نہ صرف انسانی سیرت و کردارِ اعلیٰ ترین اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے بلکہ اسے مشاہدے کے ذریعے ایمان اور ایمان کی لذتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں وہ فرماتے ہیں: "یہ سعادتِ قصوی کا حاصل ہے اور جس کو سعادتِ قصوی حاصل ہو جاتی ہے وہ نہایت قابل رشک ہو تا ہے کیونکہ وہ ایسے امور کا مشاہدہ کرتا ہے جن میں کبھی تغیر نہیں ہوتا اور ایسی آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے جس میں کسی قسم کی غلطی اور خطا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔"(32)

حصولِ اخلاق کے طریقے:

یہ مسلمہ امر ہے کہ انسان کی شخصیت کا نکھار اچھے اخلاق میں مضمر ہے۔ اچھے اخلاق کی بدولت انسان نہ صرف اس دنیا بلکہ مرنے کے بعد بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہو گا۔ ابن مسکویہ نے اچھے اخلاق کو اپنانے کی نہ صرف تلقین کی ہے بلکہ نفس کی تہذیب و تربیت کے لیے کچھ ایسے نکات پیش کیے ہیں جن پر عمل کرکے انسان اپنے اخلاق سنوار سکے۔ یہ طریقے اور نکات درج ذیل ہیں۔(33)

1- "تمام افعال و اعمال میں خیر کو شر پر، عقائد میں حق کو باطل پر، اور اقوال میں صدق کو کذب پر ہمیشہ فوقیت دینی چاہیے۔"

2- "سعادت کا ذکر اور اس کا حاصل کرنا ہمیشہ انسان کے اختیار میں رہا ہے۔"

3۔ "دائمی جہاد کرتے رہنا یعنی انسان اور نفس کے درمیان جو جنگ جاری رہتی ہے وہ دائمی ہے۔"

4- "شریعتِ اسلامیہ پر عمل کرنا اور شریعت محمدی ﷺ کے وظائف میں شامل تمام اعمال کو لازم پکڑنا"

5- "تمام جرائم کی وعیدوں کو یاد رکھنا تاکہ انسان گناہوں سے بچ سکے اور اپنے اور خدا کے درمیان معاملات کو درست رکھنا"

---

(32)ولی الدین، میر، تاریخ فلاسفۃ الاسلام، محمد لطفی جمعہ کی تاریخ فلاسفہ الاسلام کا اُردو ترجمہ، مطبوعہ کراچی، 1964ء، ص 309

Walī al-dīn, Mīr, Tārīkh falāsifa al-īslām, (Urdu Trasnlation of Muhammad Lutfī's book: History of Philosopha, Maṭbūʿa, Karāchī. 1964.P: 309

(33)ایضاً، ص304

Ibid, P: 304

6- قلة الثقة بالناس بترك الاسترسال.

"لوگوں سے امیدیں نہ لگانا اور ان سے کثرتِ اختلاط سے بچنا۔"

7- "اللہ کے ساتھ محبت رکھنا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔"

8-"جب نفس کثرتِ کلام کی طرف مائل ہو تو نفس کو کثرتِ کلام سے روکنا، اور عقل سے بھی مشورہ کرنا۔" یعنی غصے کی حالت میں خاموشی اختیار کرنا یہاں تک کہ عقل اصل معاملے کو سمجھنے اور صحیح رائے دینے کے قابل ہو جائے۔

9- "اپنے حال کی حفاظت کرنا اور استرسال کی حالت و کیفیت میں فساد اور گناہوں میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔"

10- "ہر نیک کام کی طرف پیش قدمی کرنا۔" یعنی اچھے اور پسندیدہ کاموں میں دلچسپی لینا اور اقدام کرنا۔

11- "صرف ان چیزوں کا شوق ہونا جو کہ آخرت کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں اور ان چیزوں سے اجتناب کرنا جو کہ لایعنی اور فضول ہیں۔"یعنی ادنی مشاغل کی بجائے اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی مشاغل میں مشغول رہنا۔

12- "موت کا ڈر دل سے نکال دینا اور فقر کے خوف کو بھی دل میں جگہ نہ دینا اور جتنا کارِ خیر انسان کر سکے اتنا کرتا رہے اور کثرتِ کلام چھوڑ دے۔ یعنی کاہلی سے بچنا، اور غربت و موت کے خوف سے اپنے آپ کو دور رکھنے کیلئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھنا۔"

13- "غناء اور فقر دونوں صورتوں میں اللہ پر بھروسہ رکھنا۔ نیک نیتی اور بد بختی، شائستگی اور حقارت دونوں قسم کے سلوک کا اپنے آپ کو خوگر بنانا۔"

14- "مرض کو صحت کے وقت یاد کرنا، اور غم کو خوشی کے اوقات میں، رضا کو غضب کے وقت یاد کرنا تاکہ طغی اور بغاوتِ نفس کم ہو اور اللہ رب العزت کی رضا پر راضی رہنا چاہیے اور اس سے امید رکھنی چاہیے۔"

15- اللہ رب العزت پر توکل کرنا اور تمام معاملات اس ذات کی طرف لوٹانا۔

اگر ابنِ مسکویہ کے ان پندرہ نکاتی پروگرام کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات بہت واضح ہو جائے گی کہ انہوں نے اس میں دینِ اسلام کی جملہ تعلیمات کو سمونے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ عملی طور پر انسان کو اخلاقیات کے حوالے سے جن چیزوں کو سنوارنے کی ضرورت ہوتی ہے ابن امام مسکویہ نے انہیں بیان کیا۔ اُنہوں نے ہمیشہ سچ بولنے پر زور دیا۔ صدق و کذب، عقائد و معاملات، خیر و شر، عقل، شریعت کے احکام و قوانین، غرض کہ وہ تمام امور جن کا دین نے حکم دیا اور جن کو اپنانے اور اپنی زندگی میں عملی طور پر

شامل کرنے سے انسان اپنی اخلاقیات کو راہِ راست پر لا سکتا ہے، ابن مسکویہ نے اُن تمام اُمور کو اپنے اِن نکات میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔

خلاصہ کلام:

علم الا خلاق ہر دور میں فلسفہ کا ایک اہم حصہ رہا ہے جب کہ ابن مسکویہ کی شناخت ایک ممتاز مسلم فلسفی کی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے جو نظریہ اخلاق دیا وہ ہر لحاظ سے فلسفہ اور دین کے معیارات پر پورا اُترتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے مسلم فلاسفرز مثلاً امام غزالیؒ، نصیر الدین طوسی، جلال الدین دوانی، شیخ محمد عبدہُ اور علامہ اقبالؒ جیسے لوگ اُن کے نظریہ اخلاق سے متاثر ہوئے اور اُن کے خوشہ چین بنے۔

ابنِ مسکویہ کے نظریہ سعادت میں ایک طرف تو انسانی زندگی کا انتہائی نصب العین دیا گیا ہے جو کہ سعادتِ حقیقی کا حصول ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ دوسری طرف اس نصب العین کے حصول کے لیے لائحہ عمل کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے سعادت کے پہلے درجہ کے حصول کے لیے چار بنیادی اوصاف یعنی شجاعت، عفت، حکمت اور عدالت کو اپنانا ہو گا۔ جب کہ دوسرے یعنی اعلیٰ درجہ کے حصول کے لیے معرفت (خدا کی پہچان اور کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہی) کو حاصل کرنا ہو گا۔ اگر انسان اس نہج پر اپنی سیرت و کردار کو اُستوار کر لے تو وہ دنیا و آخرت میں ہر جگہ سُرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرں کے لیے قابلِ رشک اور مثالی نمونہ بن سکتا ہے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.